قسط ۳ — جناب وحید الدین خان

قانون سازی کا حق کسے حاصل ہے؟

یہاں میں چند مثالیں دوں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ دعویٰ کس قدر صحیح ہے کہ صرف خدائی مذہب ہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس سے ہم انسانی زندگی کا قانون اخذ کر سکتے ہیں۔

معاشرت اسلام کی نظر میں عورت مرد دونوں برابر نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے دونوں صنفوں کے درمیان آزادانہ اختلاط کو سخت ناپسند کیا ہے۔ اور اس کو بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد جب سائنسی دور شروع ہوا تو اس اصول کا بہت مذاق اڑایا گیا۔ اور اس کو دورِ جہالت کی یادگار قرار دیا گیا۔ بڑے زور شور سے یہ بات کہی گئی کہ عورت مرد دونوں یکساں ہیں۔ اور دونوں مساوی طور پر نسلِ انسانی کے وارث ہیں۔ ان کے میل جول کے درمیان کوئی دیوار کھڑی کرنا ایک جرمِ عظیم ہوگا۔ چنانچہ ساری دنیا میں اور خاص طور سے مغرب میں اس اصول پر ایک نئی سوسائٹی ابھرنا شروع ہوئی۔ مگر طویل تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ پیدائشی طور پر دونوں یکساں نہیں ہیں، اس لئے دونوں کو یکساں فرض کر کے جو سماج بنایا جائے وہ لازمی طور پر بیشمار خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔

پہلی بات یہ کہ عورت اور مرد میں فطری صلاحیتوں کے زبردست نوعی اختلافات ہیں۔ اس لئے دونوں کو مساوی حیثیت دینا اپنے اندر ایک حیاتیاتی تضاد رکھتا ہے۔ ڈاکٹر الکسس کیرل عورت اور مرد کے فعلیاتی (PHYSIOLOGICAL) فرق کو بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

> "مرد اور عورت کا فرق محض جنسی اعضا کی خاص شکل، رحم کی موجودگی، حمل یا طریقۂ تعلیم ہی کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ اختلافات بنیادی قسم کے ہیں۔ خود نسیجوں کی بناوٹ اور پورے نظامِ جسمانی کے اندر خاص کیمیائی مادے جو خصیۃ الرحم سے مترشح ہوتے رہتے ہیں، ان اختلافات کا حقیقی باعث ہی صنفِ نازک کی ترقی کے حامی ان بنیادی حقیقتوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں جنسوں کو ایک

ہی قسم کے اختیارات اور ایک ہی قسم کی ذمہ داریاں ملنی چاہئیں حقیقت یہ ہے کہ عورت مرد سے بالکل ہی مختلف ہے۔ اس کے جسم کے ہر ایک خلیے میں زنانہ پن کا اثر موجود ہوتا ہے۔ اس کے اعضا اور سب سے بڑھ کر اس کے اعصابی نظام کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ فعلیاتی قوانین (PHYSIOLOGICAL LAWS) اتنے ہی اٹل ہیں جتنے کہ فلکیات (SIDEREAL WORLD) کے قوانین اٹل ہیں۔ انسانی آرزوں سے ان کو بدلا نہیں جاسکتا۔ ہم ان کو اسی طرح ماننے پر مجبور ہیں جسطرح وہ پائے جاتے ہیں۔ عورتوں کو چاہیئے کہ اپنی فطرت کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو ترقی دیں اور مردوں کی نقالی کرنے کی کوشش نہ کریں۔

(MAN THE UNKNOWN, P-93)

عملی تجربہ بھی اس فرق کی تصدیق کر رہا ہے۔ چنانچہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اب تک عورت کو مرد کے برابر درجہ نہ مل سکا۔ حتیٰ کہ وہ شعبے جو خاص طور پر عورتوں کے شعبے سمجھے جاتے ہیں، وہاں بھی مرد کو عورت کے اوپر فوقیت حاصل ہے۔ میری مراد فلمی ادارے سے ہے، نہ صرف یہ کہ فلمی اداروں کی تنظیم تمام تر مردوں کے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ اداکاری کے اعتبار سے بھی مرد کی اہمیت عورت سے زیادہ ہے۔ چنانچہ آج ایک مشہور ترین فلم ایکٹر ایک فلم کے لئے چھ لاکھ روپے لیتا ہے جبکہ مشہور ترین فلم ایکٹرس کو چار لاکھ ملتے ہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ اگر ہم طبیعی اور فلکیاتی قوانین کو تسلیم نہ کریں اور ان کے خلاف چلنا شروع کر دیں تو یہ صرف ایک واقعہ کا انکار ہی نہیں ہوگا بلکہ ہمارا سر بھی ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح عورت اور مرد کی جداگانہ حیثیات کو نظر انداز کر کے انسان نے جو نظام بنایا۔ اس نے تمدن کے اندر زبردست خرابیاں پیدا کر دیں۔ مثال کے طور پر اس غلط فلسفے کی وجہ سے دونوں صنفوں کے درمیان جو آزادانہ اختلاط پیدا ہوا ہے، اس نے جدید سوسائٹی میں نہ صرف عصمت کا وجود باقی نہیں رکھا۔ بلکہ ساری نوجوان نسل کو طرح طرح کی اخلاقی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ آج مغربی زندگی میں یہ بات عام ہے کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی ڈاکٹر کے کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ اس کو سر درد اور بے خوابی کی شکایت ہے۔ وہ کچھ دیر اپنی ان تکالیف پر گفتگو کرتی ہے۔ اس کے بعد ایک مرد کا ذکر شروع کر دیتی ہے جس سے ابھی وہ جلد ہی ملی تھی۔ اتنے میں ڈاکٹر محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ رک رہی ہے۔ تجربہ کار ڈاکٹر اس کی بات سمجھ کر آگے بات شروع کر دیتا ہے۔

WELL, THEN HE ASKED YOU TO HIS FLAT. WHAT DID YOU SAY—?

لڑکی جواب دیتی ہے :

HOW DID YOU KNOW ? I WAS JUST GOING TO TELL YOU THAT !

اس کے بعد لڑکی جو کچھ کہتی ہے، اس کو ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں۔ چنانچہ علمائے جدید خود بھی اس تلخ تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آزادانہ اختلاط کے بعد عصمت وعفت کا تحفظ ایک بے معنی بات ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف کثرت سے مضامین اور کتابیں شائع کئے جا رہے ہیں، ایک مغربی ڈاکٹر کے الفاظ میں :

THERE CAN COME A MOMENT BETWEEN A MAN AND A WOMAN WHEN CONTROL AND JUDGEMENT ARE IMPOSSIBLE.

یعنی اجنبی مرد اور اجنبی عورت جب باہم آزادانہ مل رہے ہوں تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب فیصلہ کرنا اور قابو رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کی خرابیوں کو مغرب کے دردمند افراد شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اس سے اس قدر مرعوب ہیں کہ اصل بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک نہایت قابل اور مشہور خاتون ڈاکٹر میرین ہیرڈ نے آزادانہ اختلاط کے خلاف سخت مضمون لکھا ہے، وہ کہتی ہیں :

AS A DOCTOR, I DONT BELIEVE THERE IS SUCH A THING AS PLATONIC RELATIONSHIP BETWEEN A MAN AND A WOMAN WHO ARE ALONE TOGETHER A GOOD DEAL.

یعنی بحیثیت ڈاکٹر میں اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ عورت اور مرد کے درمیان بے ضرر تعلقات بھی ممکن ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہی خاتون ڈاکٹر لکھتی ہیں :

"میں اتنی غیر حقیقت پسند نہیں ہو سکتی کہ یہ مشورہ دوں کہ نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے کا بوسہ لینا چھوڑ دیں، مگر اکثر مائیں اپنی لڑکیوں کو اس سے آگاہ نہیں کرتیں کہ بوسہ صرف اشتہا پیدا کرتا ہے نہ کہ وہ جذبات کو تسکین دیتا ہے۔"

(ریڈرز ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۵۷ء)

خاتون ڈاکٹر یہ کہہ کر بالواسطہ طور پر خدائی قانون کو تسلیم کرتی ہے کہ آزادانہ اختلاط کے ابتدائی مظاہر جو مغربی زندگی میں نہایت عام ہیں وہ جذبات میں ٹھہراؤ پیدا نہیں کرتے، بلکہ اشتہا کو بڑھا کر مزید تسکین نفس کی طرف دھکیلتے ہیں، اور بالآخر انتہائی جنسی جرائم تک پہنچا دیتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس کی سمجھ

میں نہیں آتا کہ اس محرک شیطنت کو کس طرح حرام قرار دے۔

۲۔ اسی طرح اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کو بھی تہذیب جدید نے بڑے زور شور کے ساتھ جہالت کا قانون قرار دیا ہے۔ مگر تجربے نے ظاہر کر دیا ہے کہ اسلام کا یہ اصول انسانی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ کیونکہ چند زوجیت کے قانون کو ختم کرنا دراصل درجنوں غیر قانونی زوجیت کا دروازہ کھولنا ہے۔

یہاں میں اقوام متحدہ کے ڈیموگرافک سالنامہ ۱۹۵۹ء کا حوالہ دوں گا۔ اس میں اعداد و شمار کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ کہ جدید دنیا میں جو صورت حال ہے۔ وہ یہ کہ بچے "اندر سے کم اور باہر سے زیادہ" پیدا ہو رہے ہیں۔ ڈیموگرافک سالنامہ کے مطابق ان ملکوں میں حرامی بچوں کا تناسب ساٹھ فیصدی ہے، اور بعض ممالک مثلاً پناما میں تو چار میں سے تین بچے پادریوں کی مداخلت یا سول میرج رجسٹری کے بغیر ہی پیدا ہو رہے ہیں۔ یعنی ۷۵ فیصدی حرامی بچے۔ لاطینی امریکہ میں اس قسم کے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

متحدہ اقوام کے اس ڈیموگرافک سالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ملکوں میں حرامی بچوں کی پیدائش کا تناسب نفی کے برابر ہے، چنانچہ اس میں بتایا گیا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) میں ناجائز بچوں کا تناسب ایک فیصدی سے بھی کم ہے۔ جبکہ متحدہ عرب جمہوریہ تمام مسلم ملکوں میں شاید سب سے زیادہ مغربی تہذیب سے متاثر ہوا ہے مسلم ممالک دور جدید کی اس عام وبا سے محفوظ کیوں ہیں۔ اس کا جواب متحدہ اقوام کا سالنامہ مرتب کرنے والے ایڈیٹروں نے یہ دیا ہے کہ چونکہ مسلم ممالک میں چند زوجیت (POLY GAMY) کا رواج ہے۔ اس لئے وہاں ناجائز ولادتوں کا بازار گرم نہیں ہے۔ چند زوجیت کے اصول نے مسلم ملکوں کو وقت کے اس طوفان سے بچا لیا ہے۔ ("MOVE OUT THAMIN" مطبوعہ ہندوستان ٹائمس ۱۲ ستمبر ۱۹۶۰ء)

اس طرح تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ سابق غذائی اصول ہی زیادہ صحیح اور مبنی بر حقیقت تھا۔

تمدن | اسلام میں قتل عمد کی سزا موت ہے الا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں لیکن جدید دور ترقی میں جہاں مذہب کی اور تعلیمات کے خلاف ذہن پیدا ہوا کسی طرح سزائے قتل کے بارے میں بھی سخت تنقیدیں کی جانے لگیں۔ ان حضرات کا خاص استدلال یہ ہے کہ اس قسم کی سزا کا مطلب یہ ہے۔ کہ ایک انسانی جان کے ضائع ہونے کے بعد دوسری انسانی جان کو بھی کھو دیا جائے۔ پچھلے برسوں میں اکثر ملکوں میں اس رجحان نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے اور پھانسی کی بجائے قید کی سزائیں تجویز کی جا رہی ہیں ——

اسلام نے قاتل کی جو سزا مقرر کی ہے اس میں دو اہم ترین فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک شخص نے

سوسائٹی کے ایک فرد کو قتل کر کے جس برائی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسکی جڑ آئندہ کے لئے کٹ جائے۔ مجرم کا یہ عبرتناک انجام دیکھ کر دوسرے لوگ آئندہ اس قسم کی ہمت نہ کر سکیں۔ اسی کے ساتھ دیت کی جو صورت ہے اس میں گویا اسلام نے نتائج کا لحاظ کیا ہے ـــــ مثلاً اگر کسی کے والدین بوڑھے ہوں اور ان کا اکلوتا بیٹا قتل ہو جائے تو وہ بے سہارا رہ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں قاتل کو سزائے موت بھی مل جائے تو انہیں کیا فائدہ۔ اسلام نے ایسے والدین کی تلافی کے لئے یہ طریقہ رکھا ہے کہ قاتل کے ورثار مقتول کے والدین کو ایک خاص رقم بطور خون بہا دے کر انہیں راضی کر لیں۔ اور وہ قتل کو معاف کر دیں۔ اس صورت میں مقتول کے بوڑھے والدین کو مثلاً دس ہزار روپے کی رقم مل جائے گی۔ اور وہ اس رقم سے اپنی گزر بسر کا انتظام کر سکیں گے۔ مخصوص حالات میں ریاست کو بھی یہ حق ہے کہ وہ دیت کی رقم میں اضافہ کر دے تاکہ بے سہارا ورثار خسارے میں نہ رہیں۔

یہ ایک نہایت حکیمانہ قانون ہے۔ اور اس کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ جہاں رائج ہوا قتل کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے برعکس جن ممالک میں سزائے موت کو منسوخ کیا گیا ہے۔ وہاں جرائم گھٹنے کی بجائے اور بڑھ گئے ہیں اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے ممالک میں قتل کی وارداتوں میں بارہ فیصدی تک اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسکی بھی مثالیں موجود ہیں کہ پہلے سزائے موت کو منسوخ کیا گیا، اور اس کے بعد نتائج دیکھ دوبارہ اسے بحال کیا گیا۔ سیلون اسمبلی نے ۱۹۵۶ء میں ایک قانون پاس کیا جس کے مطابق سیلون کی حدود میں موت کی سزا کو ختم کر دیا گیا۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد سیلون میں جرائم تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئے۔ ابتداً لوگوں کو ہوش نہیں آیا، مگر ۲۶ ستمبر ۱۹۵۹ء کو جب ایک شخص نے سیلون کے وزیر اعظم بندرانائک کے مکان میں گھس کر نہایت بیدردی کے ساتھ ان کو قتل کر دیا تو سیلون کے قانون سازوں کی آنکھ کھلی اور وزیر اعظم کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے فوراً بعد سیلون اسمبلی کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جس میں چار گھنٹے کے بحث و مباحثہ کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ سیلون کی حکومت ۱۹۵۶ء کے قانون کو منسوخ کر کے ملک میں سزائے موت کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ ■■

ممتاز علمی و دینی مجلہ
ماہنامہ
صدائے اسلام
ادارت : محمد اشرف علی قریشی
پاکیزہ اور مفید دینی معلومات علمی مضامین کے لئے
مطالعہ فرمائیے۔ زر سالانہ ۷/ روپے، فی پرچہ ۷۰ پیسے۔
ماہنامہ صدائے اسلام جامعہ اشرفیہ پشاور